حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

پیکرِ نحیف، اثرِ جلیل

وہ ہستی جس کے احسان کا قرض ہر کلمہ گو کی گردن پر ہے

از

فیصل الزامل

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جی ہاں! اس عظیم انسان نے جزیرہ نما عرب کو متحد کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ان کا دورِ خلافت اس اسلامی امت کی بنیاد بنا جسے ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ ظاہری وضع قطع میں وہ ایک دبلے پتلے انسان تھے اور ان کا کمر کا نچلا حصہ تھوڑا سا جھکا ہوا تھا، جس کی وجہ سے جو تہبند وہ کمر کے گرد باندھتے تھے، وہ اکثر اسے بار بار مضبوطی سے باندھنے سے پہلے ہی نیچے سرک جاتا تھا۔ وہ نہایت نرم مزاج اور نرم دل انسان تھے۔ وہ انتہائی پر درد اور رقت آمیز آواز میں قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے جس سے مکہ والوں کے دل بیدار ہو جاتے تھے، خاص طور پر جب وہ اس آیت کی تلاوت کرتے:

وَيَا قَوْمِ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ. تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ. لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنَّ مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ (سورۃ غافر 41:40-43)

"اور اے میری قوم! مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو؟ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراوں جس کا مجھے کوئی علم نہیں، جبکہ میں تمہیں زبردست اور معاف کرنے والے (اللہ) کی طرف بلا رہا ہوں۔ یقیناً تم مجھے جس کی طرف بلا رہے ہو، اس کی کوئی دعوت نہ دنیا میں کارآمد ہے اور نہ آخرت میں، اور ہمارا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، اور حد سے گزرنے والے ہی جہنمی ہیں۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی نہایت خوش الحانی سے تلاوت کرتے تھے۔ ان کی تلاوت مکہ کے لوگوں کو مسحور کر دیتی تھی، چنانچہ لوگ ان کے گھر کے گرد انہیں سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ جب

قریش کے رہنماؤں کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس کسی کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "اپنے ساتھی سے کہیں کہ وہ اعلانیہ نماز نہ پڑھا کریں کیونکہ ان کی تلاوت ان کے لڑکوں کو بگاڑ رہی ہے" ان کا مطلب ان کے وہ غلام تھے جو آزادی کی اس پکار پر لبیک کہہ رہے تھے جو رنگ، نسل یا قبیلے کی کسی بھی تفریق کے بغیر انسانوں کے درمیان مطلق مساوات کو تسلیم کرتی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غلامی اور نسل پرستی کی قوتوں کے خلاف جنگ لڑی اور غلاموں کو خرید کر آزاد کیا۔ ان کے ذریعے آزاد کیے جانے والے غلاموں میں سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے۔

ہم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اس نرم اور ملائم طبیعت کو اس وقت غائب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جب نبی کریم ﷺ کی وفات کی ہولناک خبر پھیل گئی، جس نے جزیرہ نما عرب کو اتھل پتھل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ صدمے اور حیرت و پریشانی میں مبتلا تھے۔ ان میں سے کچھ خاموشی اور غم کے عالم میں مسجد کے کونوں میں بیٹھ گئے۔

اپنی وفات سے قبل رسول اللہ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں (موجودہ) اردن کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک بڑے لشکر کی روانگی کا حکم دیا تھا۔ جبکہ لشکر جنگ کے لیے تیار تھا، نبی کریم ﷺ علالت کا شکار ہو گئے۔ خلیفہ بننے کے بعد پہلا مسئلہ جس کا فیصلہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کرنا تھا، وہ یہ تھا کہ مدینہ سے باہر رکا ہوا یہ لشکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو، یا نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر اس مہم کو ترک کر دیا جائے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ یہ نبی کریم ﷺ کا حکم تھا کہ لشکر کو اردن بھیجا جائے، اس لیے اس کی تعمیل ہر قیمت پر ہونی چاہیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں خلافت کے اپنے دور کا آغاز اللہ کے نبی کے واضح حکم کی خلاف ورزی سے نہیں کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، نبی کریم ﷺ کا حکم نافذ ہو کر رہے گا۔" حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ نقطۂ نظر ان کی وفاداری، جاں نثاری اور اس پختہ ایمان کا عکاس تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی حکم دیا تھا، وہ ریاست کے بہترین مفاد میں تھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے تیسرے دن، خلیفہ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسامہ کے لشکر کی روانگی کا اعلان کر دیا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا۔ بیس دن کے سفر کے بعد لشکر فلسطین پہنچا اور رومیوں سے قتال کیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ عظیم فتح کے ساتھ اور بغیر کسی نقصان کے مدینہ واپس لوٹے، جس نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان و یقین اور مسلمانوں کی طاقت و یکجہتی کو بھی ثابت کر دیا۔ یہ فتح بدامنی اور انتشار کے انتہائی نازک وقت میں حاصل ہوئی۔ فتح کی خبر پورے جزیرہ نما عرب میں پھیل گئی۔ یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور مرتدین کے خلاف جنگ کا ایک طاقتور آغاز تھا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت 2 سال، 3 ماہ اور 8 دن رہا۔ جس کے دوران ہم دو نمایاں واقعات پر بات کریں گے:

1- فتنہ ارتداد کے خلاف آپ کا موقف

2- سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ

نوٹ: ہم نے یہاں تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا، کیونکہ سقیفہ کا واقعہ پہلے پیش آیا تھا، ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ پہلے فتنہ ارتداد کے اثرات کو واضح کیا جاسکے، جس کے بعد ہم اس مضمون کے دوسرے حصے میں سقیفہ کی تفصیلات کی طرف لوٹیں گے۔

1- فتنہ ارتداد کا قلع قمع: (اسے ہم چار مراحل میں بیان کریں گے)

(1) ارتداد کے خلاف آپ کا موقف، دینِ خاتم کے بارے میں آپ کے جامع اور مکمل نقطۂ نظر کا عکاس تھا: یمن میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ قبیلہ مذحج مرتد ہو گیا؛ طلیحہ بن خویلد نے نبوت کا دعویٰ کیا اور بنو اسد، غطفان، طے اور غوث نے اس کی پیروی کی؛ سجاح نے نبوت کا دعویٰ کیا جس کے ساتھ بنو تغلب مل گئے اور بنو تمیم نے اس کی حمایت کی؛ اور مسیلمہ نے یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کیا، بنو حنیفہ اس کے پیچھے چل پڑے اور اس نے ان سے نماز ساقط کر دی؛ اسی طرح عمان میں لقیط بن مالک ازدی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔

ان مرتدین نے مدینہ منورہ ایک وفد بھیجا تاکہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ سے اسلام کے کچھ ارکان، بالخصوص زکوٰۃ کو معطل کرنے پر مذاکرات کریں۔ لیکن انہوں نے اسے یکسر مسترد کر دیا اور اپنا وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: واللهِ لو مَنَعوني عِقَالا كانوا يُؤَدُّونَها إلى رَسولِ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّم لَقاتَلتُهم على مَنعِها اللہ کی قسم! اگر یہ مجھے اونٹ باندھنے کی ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں گے جو یہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے، تو میں اس پر بھی ان کے خلاف جہاد کروں گا"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: كيفَ تُقاتِلُ النَّاسَ، وقد قال رَسولُ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّم: أُمِرتُ أن أُقاتِلَ النَّاسَ حتَّى يقولوا: لا إلَهَ إلَّا اللهُ، فمَن قالها فقد عَصَمَ مِنِّي مالَه ونَفسَه إلَّا بحَقِّه، وحِسابُه على اللهِ؟ "اے ابو بکر! آپ ان لوگوں سے کیسے قتال کر سکتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: 'مجھے حکم دیا

گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں، اور جس نے یہ کہہ دیا، اس نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا سوائے اس کے شرعی حق کے، اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے؟"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: واللہِ لأُقاتِلَنَّ مَن فرَّقَ بينَ الصَّلاةِ والزَّكاةِ؛ فإنَّ الزَّكاةَ حَقُّ المالِ

"اللہ کی قسم! میں ہر اس شخص سے قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا، کیونکہ زکوٰۃ مال پر عائد شرعی حق ہے"!

چنانچہ، ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نظریہ ایک کامل اور جامع نظریہ تھا جو اس دینِ خاتم کے ٹکڑے کرنے کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اسلام ایک ایسی اکائی ہے جس کی تقسیم ممکن نہیں، اور ان کے نزدیک ایک فرض اور دوسرے فرض میں کوئی فرق نہ تھا۔ جبکہ دیگر صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ اس وقت نرمی کا پہلو اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اے خلیفۂ رسول! لوگوں کی تالیفِ قلب کیجیے اور ان کے ساتھ نرمی برتیے"۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "مجھے تم سے مدد کی امید تھی اور تم میرے پاس مایوسی لے کر آئے ہو؟ تم جاہلیت میں تو بڑے سخت (بہادر) تھے اور اسلام میں اتنے کمزور پڑ گئے؟ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور دین مکمل ہو چکا ہے، تو کیا میرے جیتے جی اس میں کوئی کمی کی جائے گی؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ: 'سوائے اس کے حق کے'؟ اور نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی اسی کے حق میں شامل ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تمام لوگ بھی میرا ساتھ چھوڑ دیں، تو میں اکیلا اپنی جان سے ان کے خلاف جہاد کروں گا"۔

(2) اگر فتنۂ ارتداد کامیاب ہو جاتا، تو اسلام کا وجود ہی باقی نہ رہتا: اگر فتنۂ ارتداد کامیاب ہو جاتا، تو اسلام کا وجود ہی باقی نہ رہتا، ایک نرم طبع اور دبلے پتلے انسان کے اس فولادی موقف نے دینِ اسلام کی بقا کو اسی شکل میں محفوظ رکھا جس شکل میں وہ نازل ہوا تھا۔ اگر یہ تاریخی موقف نہ ہوتا تو : دین کے ارکان ایک ایک کر کے بکھر جاتے۔ مسیلمہ نے تو لوگوں سے نماز ہی ساقط کر دی تھی، اور اس کے بعد زکوٰۃ کی باری آتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم اس نسل سے ایک ایسا عجیب و غریب دین حاصل کرتے جس کا آج کے اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوتا؛ ایک ایسا دین جو سراسر ابہام، نظریاتی انتشار اور متزلزل اصولوں پر مبنی ہوتا، وہ بھی ایک ایسے دور میں جو طبقاتی اونچ نیچ اور قبیلہ پرستی کے عروج کا دور تھا۔

دین خالصتاً علاقائی رنگ اختیار کر لیتا، یعنی جو چیز یمن کے لیے موزوں ہوتی وہ عمان میں نافذ ہونے والے قوانین سے مختلف ہوتی۔ اس طرح یہ ایک ایسا دین بن جاتا جس کے قوانین انسان اپنی مقامی ثقافت کے مطابق طے کرتے، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک ایسا معمہ بن جاتا جسے دنیا کے دیگر حصوں میں قبول کرنا ناممکن ہوتا؛ بالکل اسی طرح جیسے حملہ آور منگولوں کے مذہب کے ساتھ ہوا جنہوں نے زمین پر قتل و غارت گری مچائی تاکہ پوری دنیا ان کی ایک سلطنت بن جائے، جبکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی فطرت اور عقلِ سلیم سے ہم آہنگ ہے، یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسانی نے اپنے تمام تر نظریاتی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود اسے دل سے قبول کیا۔

اگر یہ سخت موقف نہ اپنایا جاتا، تو اسلام کا دائرہ صرف مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ تک محدود ہو کر رہ جاتا، اور یہ نہ تو اتنی تیز رفتاری سے پھیلتا اور نہ ہی دنیا کے ان تمام خطوں میں اتنی مضبوطی سے جڑیں پکڑ پاتا جہاں یہ پہنچا۔ اس سب کی وجہ اس دبلے پتلے انسان کا وہ چٹان جیسا مضبوط موقف تھا۔ جب حروبِ ارتداد کا خاتمہ شاندار فتح پر ہوا، تو حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں داخل ہوئے اور سیدھے ابو بکر کی طرف بڑھے جو صدرِ مجلس میں تشریف فرما تھے۔ حضرت عمر نے تمام لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر

اپنے طویل قد کے ساتھ جھکتے ہوئے ان کے سر کا بوسہ لیا اور فرمایا" : میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اے خلیفۂ رسول! اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو چکے ہوتے"۔

جی ہاں! مدینہ منورہ لشکرِ اسامہ کی روانگی کی بدولت اپنے ہی گھر میں مغلوب ہونے سے بچ گیا، اور اللہ تعالیٰ نے مرتدین کے مطالبات کو مسترد کر کے پوری انسانیت کے لیے اسلام کو آسمان سے نازل شدہ شکل میں کامل و اکمل محفوظ فرما لیا۔ اس کے بعد نماز اور زکوٰۃ کے احکام کی تعلیمات مسلسل پھیلتی رہیں۔ اگر یہ موقف نہ ہوتا تو شاید ہم نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بھی نہ سن پاتے کہ: أرأيتُم لو أنَّ نَهَراً بِبابِ أحدِكم يَغتسِلُ منه كلَّ يومٍ خَمساً، هل يُبْقي من دَرَنِه شيئاً تمہارا کیا خیال ہے، اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ بار غسل کرتا ہو، تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل باقی رہے گا؟ صحابہ نے عرض کیا" : نہیں، کچھ میل باقی نہیں رہے گا"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: كذلك الصلواتُ الخَمْسُ يَمْحُو اللهُ بهنَّ الخَطايا یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

مسیلمہ اور سجاح کے خود ساختہ دین میں ہم ایسی احادیث کبھی نہ سن پاتے۔ یہاں تک کہ توحید اور ربوبیت کا درست تصور بھی دھندلا جاتا۔ لوگوں نے پوچھا تھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہمارا رب ہمارے قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں، یا دور ہے کہ ہم اسے پکاریں؟" تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عني فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ "اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو انہیں فرما دیں کہ میں یقیناً قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے۔"

اور جب نبی کریم ﷺ نے ایک سفر کے دوران لوگوں کو چیخ چیخ کر اونچی آواز میں دعا کرتے دیکھا تو فرمایا : "اے لوگو! اپنے آپ پر نرمی کرو، تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے، بلکہ تم تو سب کچھ سننے والے اور دیکھنے والے کو پکار رہے ہو"۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہدایت کے ان تمام میناروں کا وجود ہی ختم ہو جاتا جو اسلام لے کر آیا ہے؛ یہ سب اپنی ابتدا ہی میں مسمار ہو جاتے اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ نظریاتی موقف نہ ہوتا جسے تاریخ نے انتہائی احترام کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔

(3) فیصلہ سازی کے لیے اکثریت شرط نہیں ہے: ایک اور سبق جو ہم سیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے اکثریت کی رائے نہیں تھی۔ چنانچہ، اسلام میں شوریٰ (مشاورت) حکمران کے لیے واجبِ تعمیل نہیں ہے اگر اس کے پاس اکثریت کے مخالف کوئی مضبوط دلیل یا رائے ہو۔ شوریٰ اس لحاظ سے مشورے کے لیے ہے، حتمی پابندی کے لیے نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (سورۃ آل عمران 3:159) "پس انہیں معاف کر دیجئے، ان کے لیے مغفرت طلب کیجئے اور معاملے میں ان سے مشورہ کیجئے۔ پھر جب آپ عزم کر لیں، تو اللہ پر توکل کیجئے۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

یہ اختیارات کی علیحدگی کے اصول کی بنیاد ہے؛ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جسے جدید دور میں فرانسیسی سیاسی مفکر مونٹیسکیو نے وضع کیا اور قدیم رومیوں نے اسے اپنایا۔ انہوں نے ریاستی اختیارات کو انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں تقسیم کیا۔ اگرچہ عدلیہ واضح طور پر آزاد تھی، لیکن انتظامی طاقت مختلف نظاموں کے درمیان ڈانواڈول رہی۔ تاہم، شوریٰ کا اصول ایک معیار ہے، اور سربراہِ مملکت کو شوریٰ یا مشاورت سے مشورہ لینے

کے بعد اپنے اختیارات کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا کہ مشاورت کی اور اس کے بعد اپنے اختیارات کا استعمال کیا خواہ اکثریت ان کی مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ قرآنِ کریم میں اس کی ایک واضح مثال موجود ہے، جسے ہم حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یمن کے واقعے میں دیکھ سکتے ہیں۔ جب انہوں نے اس وقت کی ملکہ (بلقیس) کو خط لکھا، تو ملکہ نے اپنے وزراء اور مشیروں کو جمع کیا، انہوں نے جنگ کا راستہ چننے کا مشورہ دیا اور اس سے کہا: "عاقبت کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ جو بھی حکم دیں گی ہم اس کے لیے کھڑے ہیں"۔ ملکہ نے خود کو اس انتخاب کا پابند نہیں کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سیاسی مکالمے کا راستہ اختیار کیا، جیسا کہ سورۃ النمل میں ہے:

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي أَمْرِي مَا كُنتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّىٰ تَشْهَدُونِ (32) قَالُوا نَحْنُ أُولُو قُوَّةٍ وَأُولُو بَأْسٍ شَدِيدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ (33) قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (34) وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِم بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ (سورۃ النمل: آیات 33-35)

اس نے کہا، "اے سردارو! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو۔ میں کسی معاملے کا حتمی فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم میرے پاس حاضر نہ ہو"، انہوں نے کہا، "ہم بڑی قوت اور سخت لڑنے والے ہیں، لیکن اختیار آپ کے پاس ہے، پس آپ دیکھ لیجئے کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں"، اس نے کہا، "بلاشبہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت دار لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں"۔

لہذا حتمی فیصلہ ریاست کے سربراہ کے ذمہ ہوتا ہے اور وہ شوریٰ کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر 'اختیارات کی علیحدگی (Separation of Powers) 'کا اصول قائم ہے۔ اس اصطلاح کو جدید دور میں فرانسیسی سیاسی مفکر 'مونٹیسکیو' نے ان الفاظ میں وضع کیا، جبکہ قدیم رومیوں نے بھی اس پر عمل کیا تھا، جس کے تحت حکومت کے شعبوں کو انتظامیہ(Executive) ، مقننہ (Legislative)اور عدلیہ (Judiciary) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ عدلیہ اپنے فیصلوں کی آزادی میں بالکل واضح ہے اور انتظامیہ کی درخواستیں مختلف نظاموں میں بدلتی رہتی ہیں، لیکن اسلام میں شوریٰ کا نمونہ یہ ہے کہ وہ ایک رہنما اور مشاورتی حیثیت رکھتی ہے، جیسا کہ اس واقعے کے اثرات سے بالکل واضح ہے۔ اگر ریاست کا سربراہ مشاورت کے بعد اپنے اختیارات کا استعمال ہی نہ کر سکے، تو اس کے منصب کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ طرزِ عمل تھا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، اور اکثریت کی مخالفت بھی انہیں اپنے فیصلے سے نہ روک سکی۔

(4) حروبِ ارتداد کا اسٹریٹجک پہلو "جزیرہ نما عرب کا اتحاد" تھا: اسٹریٹجک سطح پر دیکھا جائے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ایک ایسا جزیرہ نما عرب ملا جو مکمل طور پر متحدہ تھا۔ اگر یہ اتحاد قائم نہ ہوتا، تو مسلم افواج کبھی بھی مشرق، مغرب اور شمال کی جانب پیش قدمی نہ کر پاتیں۔ اس اتحاد کے بغیر وہ اسلامی تاریخ کبھی اس شان اور تیز رفتاری کے ساتھ رقم نہ ہو پاتی جو ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں دیکھی، جس کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ: "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی سلطنت روزانہ اڑھائی سو(250) کلومیٹر کی رفتار سے پھیل رہی تھی"۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی فتوحات اور کارناموں کی مضبوط ترین بنیاد تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اس بات کا سرِ عام اعتراف کیا کرتے تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عظیم کردار اور اسلامی ریاست کی عالیشان عمارت کی تعمیر کی

قدر دانی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: لَيْتَنِي كُنْتُ شَعْرَةً فِي صَدْرِ أَبِي بَكْرٍ " کاش میں ابو بکر کے سینے کا ایک بال ہوتا"۔ اللہ تعالیٰ صدیق اور فاروق دونوں سے راضی ہو اور ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

آیئے ایک بار پھر اس عظیم انسان کے ان مواقف اور کلمات کی طرف لوٹتے ہیں جو ان کی شخصیت میں موجود ایک "فرماں بردار سپاہی" کو ظاہر کرتے ہیں؛ ایک ایسی شخصیت جس میں دنیاوی معاملات کے لیے نرمی ورقت اور عقیدے کے معاملے میں اٹل سختی یکجا تھی، اور یہی نبی کریم ﷺ کا اصل طریقہ کار تھا:

- صلحِ حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ کا فیصلہ قریش کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنا تھا، جس کی رو سے مسلمانوں کو اس سال عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جانا تھا۔ اس شرط کو قبول کرنا مسلمانوں کے لیے انتہائی گراں گزر رہا تھا اور ان میں سب سے زیادہ رنجیدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ عمر بار بار اصرار کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے بحث کر رہے ہیں، تو انہوں نے ایک کامل فرماں بردار سپاہی کی طرح ان سے کہا: "اے عمر! بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں، لہذا ان کی رکاب تھامے رکھو (ان کے نقشِ قدم پر چلو)"۔ یعنی تمہیں پوری فرماں برداری کے ساتھ ان کی پیروی کرنی چاہیے اور اپنا قدم وہیں رکھنا چاہیے جہاں سے وہ اپنا قدم اٹھائیں۔ یہ تھی وہ حقیقی سپاہیانہ بصیرت جسے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا۔
- (لشکر کی روانگی کے وقت) قائدِ لشکر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑے پر سوار تھے جبکہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پیدل چل رہے تھے۔ جب اسامہ نے نیچے اترنے کا ارادہ کیا تو ابو بکر نے فرمایا" : تم نیچے مت اترو، میرا کیا بگڑ جائے گا اگر اللہ کی راہ میں تھوڑی دیر کے لیے میرے پاؤں خاک آلود ہو جائیں"۔

پھر انہوں نے اسامہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: احْرِصْ عَلَى الْمَوْتِ تُوهَبْ لَكَ الْحَيَاةُ " موت کے خواہشمند بنو، تمہیں زندگی عطا کر دی جائے گی"۔

اللہ تعالیٰ ابو بکر صدیق پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، جو ظاہر میں ایک دبلے پتلے انسان تھے لیکن اپنے عزم اور عمل میں ایک ببر شیر تھے، اور اللہ انہیں امتِ محمدیہ کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے۔

دوم: سقیفہ بنی ساعدہ (واقعہ اپنی اصل حقیقت کے ساتھ) نبی کریم ﷺ کی وفات دوشنبہ (پیر) کے دن ۱۲ ربیع الأول ۱۱ ہجری کو ہوئی، جو کہ آپ کی ولادت کا دن بھی تھا۔ اس واقعے سے لوگوں کو شدید صدمہ پہنچا اور پورے مدینہ پر گہرا سوگ چھا گیا۔ چونکہ آپ کا حجرہ مبارک مسجد سے متصل تھا، اس لیے گھر کے اندر رونے والوں کی سسکیوں اور مسجد میں موجود لوگوں کے نالوں میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب سب پر ظاہر تھا اور وہ بلند آواز میں پکار رہے تھے: مَنْ قَالَ أَنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ ضَرَبْتُ عُنُقَهُ، وَإِنَّمَا ذَهَبَ مِثْلَمَا ذَهَبَ مُوسَى لِلِقَاءِ رَبِّهِ، وَسَوْفَ يَعُودُ "جس نے بھی یہ کہا کہ محمد (ﷺ) وفات پا چکے ہیں، میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ تو صرف اسی طرح تشریف لے گئے ہیں جیسے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے ملاقات کے لیے گئے تھے، اور وہ ضرور واپس آئیں گے"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں فرمایا تھا: وَاللَّهِ مَا فَقَدْتُ صَوَابِي فِي حَيَاتِي إِلَّا مَرَّتَيْنِ: يَوْمَ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَوْمَ قُتِلَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ "اللہ کی قسم! میں نے اپنی زندگی میں صرف دو ہی بار اپنے حواس کھوئے؛ ایک رسول اللہ ﷺ کی وفات کے دن، اور دوسرا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن"۔

اس شدید صدمے اور لوگوں کی پریشانی کے عالم میں، قبیلہ خزرج کے ایک رہنما حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ایک مشاورتی اجتماع کی دعوت دی۔ وہ خزرج کے ان مکانات کے درمیان رہتے تھے جو کھیتوں اور مدینہ کے کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں گھرے ہوئے تھے جن کا سایہ ان مکانات پر رہتا تھا۔ ان مکانات کے بیچوں بیچ ایک بڑا صحن تھا جس کے ایک طرف دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے ایک سائبان (سقیفہ) بنا ہوا تھا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اس سقیفہ کے نیچے بیٹھ گئے اور انصار کے سامنے نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کے حالات کی وضاحت کی، اور قریش کی بے وفائی کے مقابلے میں اسلامی دعوت کی حفاظت میں انصار کے لازوال کردار کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا کہ انصار نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد پورا کر دیا ہے، اور اب جبکہ آپ اپنے رب کے پاس تشریف لے جا چکے ہیں، وقت آ گیا ہے کہ اہل مدینہ اپنے معاملات سنبھالنے اور جزیرہ نما عرب میں اسلامی دعوت کی قیادت کرنے کے لیے اپنا کلیدی منصب دوبارہ حاصل کریں۔ وہ علالت کی وجہ سے انتہائی دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے اور ان کے سر پر کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی، اس لیے ان کے بیٹے قیس ان کے پاس کھڑے ہو کر ان کی باتوں کو بلند آواز میں دہرا رہے تھے تاکہ سب لوگ سن سکیں۔

اسی اثنا میں کوئی شخص مسجدِ نبوی گیا اور وہاں موجود لوگوں کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہنے لگا: "انصار کا یہ قبیلہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہو چکا ہے، اگر آپ لوگوں کو خلافت کے معاملے سے کوئی سروکار ہے تو اس سے پہلے کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے، وہاں پہنچیں"۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اٹھے اور سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ دونوں وہاں داخل ہوئے تو سب کی نظریں ان پر ٹک گئیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ علالت کی وجہ سے چادر اوڑھے بیٹھے تھے جبکہ ان کا مقرر لوگوں سے کہہ رہا تھا: "ہم اللہ کے انصار (مددگار) اور اسلام کا لشکر ہیں، اور اے مہاجرین کے گروہ! تم ہمارے نبی کے قبیلے سے ہو، اور تم میں سے

کچھ لوگ یہاں اس لیے آئے ہیں تاکہ ہمیں ہماری جڑوں سے کاٹ دیں اور ہمیں حکومت کے معاملے سے بے دخل کر دیں"۔

چنانچہ اب منظر نامہ یہ تھا کہ انصار، یا بالخصوص قبیلہ خزرج نے، مدینہ کی قیادت اور اس ریاست کی سربراہی کا مسئلہ اٹھایا تھا جس کی حدود دن بہ دن وسیع ہو رہی تھیں۔ تفصیلات میں جائے بغیر، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو کا آغاز کیا اور انصار کی فضیلت میں اللہ عزوجل کی نازل کردہ آیات یا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں سے کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جسے انہوں نے بیان نہ کیا ہو۔ اپنے خطاب میں انہوں نے فرمایا: "آپ لوگ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: 'اگر تمام لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری وادی کا رخ کریں، تو میں انصار کی وادی میں چلوں گا۔ لوگ اوپر اوڑھنے والی چادر (دثار) ہیں اور تم جسم سے متصل اندرونی لباس (شعار) ہو'۔ واضح رہے کہ شعار اس باریک کپڑے کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنا رخ براہِ راست اجتماع بلانے والے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف کیا اور فرمایا: "اے سعد! تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہاری موجودگی میں فرمایا تھا کہ: 'قریش اس معاملے (حکومت) کے والی ہیں، پس نیک لوگ ان کے نیکوں کے تابع ہوں گے اور بدکار لوگ ان کے بدکاروں کے تابع ہوں گے'۔ "اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "آپ نے سچ فرمایا، ہم وزیر (مددگار) ہیں اور آپ لوگ امیر ہیں"۔ نبی علیہ السلام کی طرف سے یہاں قریش کا نام لینے کی وجہ یہ تھی کہ تمام عرب ان کی مرکزیت پر متفق تھے کیونکہ وہ بیت اللہ کے پاسبان تھے جہاں عرب حج کے لیے آتے تھے اور جو اس میں داخل ہوتا وہ مامون ہو جاتا تھا۔ ان کے اور عرب کے دیگر قبائل کے درمیان کوئی خونی دشمنی یا عناد نہ تھا، یہاں تک کہ ان کے تجارتی قافلے تمام قبائل کے علاقوں سے گزرتے تھے اور کوئی ان کا راستہ نہیں روکتا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی گفتگو کا اختتام ان الفاظ پر کیا: "یہ عمر بن

خطاب ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ 'اے اللہ! ان کے ذریعے دین کو عزت دے'، اور یہ ابو عبیدہ بن جراح ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ نے فرمایا کہ 'یہ اس امت کے امین ہیں'، پس تم ان دونوں میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو"۔ اس پر ان دونوں نے کہا: "اللہ کی قسم! ہم کبھی آپ سے آگے نہیں بڑھ سکتے"۔

جب سقیفہ کے نیچے باتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا، شور و غل بڑھ گیا اور آوازیں بلند ہونے لگیں، تو دانشوروں کو یہ خوف لاحق ہوا کہ کہیں یہ اختلاف سنگین رخ نہ اختیار کر لے۔ اس نازک موڑ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پکار کر کہا: "اے مسلمانوں کے گروہ! نبی کریم ﷺ کے بعد حکومت کا سب سے زیادہ حقدار وہ شخص ہے جو 'دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے'۔ "یہ کہہ کر انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنی چاہی، لیکن انصار کے ایک جلیل القدر شخص بشیر بن سعد (جو نعمان بن بشیر کے والد تھے) نے ان سے پہلے بڑھ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت کی اور پھر سب لوگ یکے بعد دیگرے بیعت کرنے لگے۔ جب بیعت کا یہ عمل مکمل ہو گیا، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کے شایانِ شان ہے، اور پھر فرمایا:

"امّا بعد! اے لوگو! مجھے تمہارا نگران (حکمران) مقرر کر دیا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو میری مدد کرنا، اور اگر میں غلط راہ اختیار کروں تو میری اصلاح کرنا۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے جو کمزور ہے، وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اس کا حق اسے دلا نہ دوں، اور تم میں سے جو قوی ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے مظلوم کا حق نہ لے لوں۔ جو قوم بھی اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑ دیتی ہے، اللہ اس پر ذلت مسلط کر دیتا ہے، اور جس قوم میں بھی فحاشی عام ہو جاتی ہے، اللہ اسے بلاؤں اور مصیبتوں میں گھیر لیتا ہے۔ جب تک میں اللہ اور

اس کے رسول کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو، اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں، تو تم پر میری کوئی اطاعت لازم نہیں ہے۔ اب اپنی نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اللہ تم پر رحم فرمائے"۔

وہ انتہائی نازک لمحے تھے؛ اگر کبار صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی وفات کے اس عظیم سانحے کے وقت ان معاملات سے غافل ہو جاتے، تو تاریخ کا رخ بدل جاتا۔ اگر ہم ماضی میں جائیں اور فتحِ مکہ کے اس دن کو یاد کریں جب مدینہ منورہ کے لشکر مکہ کی بڑی شاہراہوں پر آگے بڑھ رہے تھے، اور ان میں انصار کا وہ دستہ بھی شامل تھا جس کی قیادت حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کر رہے تھے۔ جب وہ قریش کے رہنماؤں ابو سفیان اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے سے گزرے، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر فتح کے جوش میں اپنی تلوار لہراتے ہوئے کہا: الْيَوْمُ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ، الْيَوْمُ يُذِلُّ اللَّهُ قُرَيْشًا "آج خونریزی اور جنگ کا دن ہے، آج اللہ قریش کو ذلیل کرے گا"۔ یہ سن کر دونوں رہنما فوراً رسول اللہ ﷺ کی طرف لپکے، جنہوں نے اہل مکہ کے لیے عام معافی کا اعلان فرما رکھا تھا، اور آپ کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے آگاہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: الْيَوْمُ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ، الْيَوْمُ يُعِزُّ اللَّهُ قُرَيْشًا "نہیں، بلکہ آج کا دن رحمت کا دن ہے، آج اللہ قریش کو عزت عطا فرمائے گا" پھر آپ ﷺ نے یہ حتمی فیصلہ صادر فرمایا کہ جھنڈا سعد سے لے کر ان کے بیٹے قیس بن سعد کے حوالے کر دیا جائے، جو خود بھی جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ اس حکیمانہ فیصلے نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دل پر کوئی منفی اثر چھوڑے بغیر معاملے کو احسن طریقے سے حل کر دیا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے سقیفہ پہنچنے میں جو جلدی دکھائی، اس نے قیادت کو خالص قبائلی رنگ اختیار کرنے سے بچا لیا۔ اگر حکومت حضرت سعد بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں چلی جاتی، تو قبیلہ اوس انہیں کبھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا اور ان کے بعد خلافت اپنے قبیلے

میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا؛ کیونکہ دونوں قبیلوں کے درمیان پرانی رقابت اور جنگِ بعاث جیسے معرکے تاریخ کا حصہ تھے، یہاں تک کہ عہدِ نبوت میں بھی ایک یہودی نے ان کے مابین اس چنگاری کو دوبارہ بھڑکانے کی کوشش کی تھی اور دونوں قبائل نے ہتھیار اٹھا کر ایک جگہ کا تعین کر لیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ملی، تو آپ معاملے کی سنگینی کے پیشِ نظر اتنی عجلت میں باہر نکلے کہ اپنی چادر مبارک بھی گھر سے نکلتے ہوئے درست کی۔ جب آپ ان کے مجمع میں پہنچے تو فرمایا: "اے مسلمانوں کے گروہ! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو! کیا تم میرے تمہارے درمیان موجود ہونے کے باوجود جاہلیت کی پکار لگا رہے ہو؟ اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں اسلام کی ہدایت دی، تمہیں اس کے ذریعے عزت بخشی، جاہلیت کی جڑوں کو کاٹ دیا، تمہیں کفر سے نجات دی اور تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا، کیا تم پھر سے کافروں کی طرح بننا چاہتے ہو؟ "یہ سن کر لوگ سمجھ گئے کہ یہ شیطان کا فتنہ اور ان کے دشمن کی چال تھی؛ وہ رو پڑے اور ایک دوسرے کے گلے مل گئے، پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فرماں برداری کے ساتھ واپس لوٹے۔ جی ہاں! یہ مسابقت اور رقابت نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں بھی موجود تھی، اور آپ کی وفات کے بعد اس کے دوبارہ سر اٹھانے کے امکانات کہیں زیادہ تھے اگر خلافت کسی ایک قبیلے کے پاس چلی جاتی۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعے کو غلط رنگ میں پیش کرنا اس دور کے عظیم المرتبت لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہے، جس کے فوراً بعد حروبِ ارتداد کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر مدینہ منورہ کے اندر یہ اختلاف برقرار رہتا اور شاخیں نکال لیتا، تو یمامہ میں مسیلمہ، یمن میں اسود عنسی، اور سجاح اور طلیحہ بن خویلد کے عزائم کے سامنے اسلام کا نام و نشان مٹ جاتا۔ اس خطرناک موڑ پر صرف مدینہ اور مکہ ہی ثابت قدم رہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ واقعۂ سقیفہ وہ حقیقی پل تھا جس پر سے گزر کر یہ دین اس کٹھن دور سے ہم تک، ہم سے پہلے گزرنے والی صدیوں تک اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں تک پہنچا۔ اللہ تعالیٰ اس اہم دور میں مؤثر اور فعال کردار ادا کرنے والوں کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

مدینہ منورہ میں سقیفہ بنی ساعدہ کا مقام: یہ سقیفہ مسجدِ نبوی کی شمال مغربی سمت میں قبیلہ بنو ساعدہ (خزرج) کے مکانات کے درمیان واقع تھا۔ یہ سقیفہ ایک ایسے باغ کے اندر تھا جس میں متفرق مکانات بنے ہوئے تھے جہاں بنو ساعدہ کے لوگ ایک دوسرے سے متصل باغات میں رہتے تھے۔ یہ سقیفہ کافی بڑا تھا جہاں انصار کی ایک بڑی تعداد جمع ہو سکتی تھی، اور اس کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جو سقیفہ تنگ پڑنے کی صورت میں لوگوں کو سمو سکتا تھا، اور اس کے قریب بنو ساعدہ کا ایک کنواں بھی تھا۔ بعد کے ادوار میں یہ سقیفہ ایک عمارت میں تبدیل ہو گیا جس کی شکلیں زمانوں کے ساتھ بدلتی رہیں، اور آج یہ ایک پبلک پارک کی شکل میں موجود ہے جو مسجدِ نبوی کی مغربی دیوار کے بالکل سامنے واقع ہے۔